بہانہ بن گئی۔ ایسی دعوتوں میں خوراک کے انبار نظر آتے ہیں۔ ان تفریحوں میں اب کہیں کہیں سینما کی فلم نے بھی دخل حاصل کر لیا ہے۔

زرخیزی: رزق کی فراوانی کی بدولت زمین کا یہ خطہ انسانوں سے اس قدر بھرپور ہے کہ دُنیا کا کوئی اور خطۂ زمین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک مربع میل میں ایک ہزار سے زائد کی آبادی ہوتی ہے۔ اس کثرتِ آبادی کے باوجود وہاں کوئی شخص بھوکا نہیں رہتا۔ فطرت کی اس فیاضی کی بدولت جاوا کے لوگوں کو فنونِ لطیفہ سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ ان کی سنگیت میں ہر قسم کے ساز ہوتے ہیں۔ تھیٹر اور ڈرامہ کا چرچا ایسے ملک میں ایک قسم کی تعلیم و تربیت کا بھی ذریعہ ہے جہاں دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے ڈراموں میں اپنی معاشرت کی نہایت دلچسپ تنقید ہوتی ہے۔ قدیم زمانہ سے چھاپے دار رنگین کپڑے کی صنعت بھی یہاں ترقی پر رہی ہے عظیم الشان تعمیری استعداد کا ثبوت بھی یہاں ملتا ہے۔ جس زمانہ میں یہاں بدھ مت کا چرچا تھا: تو یہاں ایسے رفیع و جلیل مندر بنائے گئے جن کی مثال اور ممالک میں کم ملے گی۔ جاوا کی تہذیب اور اس کے مزاج میں ہندوستانی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے مذہب بھی ہندوستان کی طرف سے آیا تھا اور قصے، کہانیاں، داستانیں بھی ادھر ہی سے آئی تھیں۔ راجے بھی یہاں اسی انداز کے تھے ہندوؤں کی قسم کی ذات پات کی تقسیم کے عناصر بھی موجود تھے اور بدھ مت یا ویدانت کا آمیزہ تصوف بھی پایا جاتا تھا۔ اطالیہ کا مشہور سیاح مارکو پولو ۱۲۹۲ء میں اس طرف آیا تھا اور اس نے بیان کیا کہ "ہندوستان ہی کے راستہ سے یہاں اسلام بھی داخل ہو گیا ہے اور بڑی سرعت سے تمام اطراف میں پھیل رہا ہے۔" یہاں اسلام کو کوئی سیاسی قوت حاصل نہ تھی اس کے باوجود دین لوگوں کو برضا و رغبت اس قدر تسلی بخش معلوم ہوا کہ آج یہ مملکت تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے، البتہ اسلامی معاشرت کی ایک چیز یہاں کی عورتوں کو قابل قبول معلوم نہ ہوئی۔ ملاؤں اور مبلغوں نے جاوا کی مسلمان ہو جانے والی عورتوں کو کہا کہ اب تمہیں برقع بھی پہننا پڑیگا۔ لیکن جب عورتوں نے اس کا نمونہ دیکھا کہ انسان ایک غلاف میں بند ہو جاتا ہے تو اسے دیکھ کر وہ ہنس دیں نتیجہ یہ ہے کہ اکثر دیگر اسلامی ممالک کی طرح یہاں کی عورتیں نقاب پوش نہیں۔

بالی: اس مجمع الجزائر میں فقط بالی ایک ایسا جزیرہ ہے جس نے اِسلام قبول نہ کیا۔ یہ بڑا خوبصورت جزیرہ ہے اور اس میں وہی قدیم ہندو مذہب کی ایک قسم پائی جاتی ہے۔ ہالینڈ والوں نے جب اسکو مطیع کرنا چاہا، تو وہاں کے راجہ نے شدید مقابلہ کیا۔ لیکن ان بیچاروں کے پاس پرانی برچھیوں کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھے، اس لئے ہالینڈ والوں نے اپنی بندوقوں اور توپوں سے راجہ کی فوج اور رعایا کا قتل عام کر دیا۔ اس جزیرہ کا ہر بہادر میدان جنگ میں لڑتا ہوا مر گیا۔ اس جزیرہ میں ہر مرد و زن آرٹسٹ معلوم ہوتا ہے، اور یہاں کی عورتوں کا رقص دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے ایک دل آویز کشش رکھتا ہے۔ ہزاروں برس پرانے ڈرامے ابھی تک وہاں کھیلے جاتے ہیں اور اداکار و فن کار موجود ہیں۔ ان لوگوں نے نہ اِسلام کا اثر قبول کیا اور نہ مغربی تہذیب کا کوئی چھینٹا ان پر پڑا۔ عورتیں نہایت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن ان کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ ہوتا ہے۔ مغرب کے شوقینوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس جزیرہ کو اپنی قدیم اور اصلی حالت پر ہی

قتل و غارت سے تمہارے ملک پہ قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ کیا دونوں مرتبہ ہم نے ان کو شکست نہیں دی۔

عام حالات: باشندوں کے میلانات اور رجحانات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ تین سو سال کے فرنگی تسلط نے ان کو تمام اہلِ مغرب سے متنفر کر دیا ہے۔ وہ ہر مغربی قوم کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امریکہ والے بھی اسی نفرت اور شبہہ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اہلِ مغرب سے نفرت کا کوئی یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ ہم اشتراکیت کے شیدائی بن جائیں۔ ہم تو ہر قسم کے غیر ملکی غلبہ سے آزادی چاہتے ہیں۔ عوام و خواص کی اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے مقصد کے پکے اشتراکی دیہاتوں میں، ٹریڈ یونینوں میں اور یونیورسٹیوں میں مسلط ہو رہے ہیں۔ انڈونیشیا والوں کو یورپ سے اور امریکہ سے جو نفرت اور نخوت ہے۔ اس کی وجہ ہالینڈ والوں کا وہ طویل تسلط ہے جس نے رعایا کو علم و فن یا تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے سے روکے رکھا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک کے انقلاب نے دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ ہالینڈ والے ایسے اعلیٰ درجہ کے عادل حکمراں نہ تھے جیسا کہ دُنیا کو باور کرایا گیا تھا۔ ایک ٹیکنیکل ماہر نے جو کسی ذاتی تعصب کا شکار نہ تھا مجھ سے بیان کیا کہ ذرا اس ظلم اور ناانصافی پر غور کرو کہ ہالینڈ والوں نے تین سو برس تک یہاں حکومت کی اور جب وہ یہاں سے گئے تو ہماری آٹھ کروڑ قوم میں صرف ستر انجینیر تھے تعلیم کی یہ حالت تھی، کہ چار فیصد سے زیادہ لوگ پڑھ لکھ نہ سکتے تھے۔ تمام ملک میں دو سو سے زیادہ گریجویٹ نہ تھے۔ ہمارا ملک زراعتی ملک ہے لیکن فنِ زراعت کے ماہر ہماری قوم میں ناپید تھے۔ ہمارے سواحل اپنے طول میں تمام دنیا کے ملکوں سے زیادہ ہیں لیکن غیر ملکی حکمرانوں نے ہماری تمام قوم میں سے کسی ایک فرد کو بھی جہاز کا کپتان تک نہ بننے دیا۔ یہ غیر ملکی حکمراں یہی بکتے رہے کہ تم لوگوں میں جہازرانی کی اہلیت نہیں۔ ملک کی تمام دولت کو تین سو سال تک لوٹ کر یورپ پہنچاتے رہے۔ یہ ظلم ایسا ہے جسے ہم نہ فراموش کر سکتے ہیں اور نہ معاف کر سکتے ہیں۔ ہالینڈ والوں کا برطانیہ کی شہنشاہیت سے مقابلہ کیجئے تو بیّن فرق واضح ہو جائیگا۔ انگریزوں نے ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑا اور ان ملکوں نے برطانیہ کے قائم کردہ نظام پر اپنی آزادانہ تعمیر شروع کی۔ چونکہ انگریزوں نے اس ملک کے باشندوں کو ہالینڈ والوں کی طرح بالکل جاہل اور بے بس نہ کر دیا تھا اسلئے آزادی کے حصول کے بعد بھی پاکستان اور ہندوستان نے بہت سے برطانوی جرنیلوں اور سول افسروں کو اپنے نظامِ حکومت میں جگہ دی، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ غیر ملکی حکمرانی کے باوجود انگریزوں کے خلاف نفرت کا کوئی شدید جذبہ ان قوموں میں نہ تھا۔ انڈونیشیا والوں نے طویل ظلم کے انتقام کے جذبہ کی وجہ سے کسی ایک ولندیزی کو رکھنا گوارہ نہ کیا۔ ہالینڈ والوں کی زبان کو بھی اکھاڑ پھینکا۔ انڈونیشیا والوں کو ہر قسم کے ماہرین کی شدید ضرورت ہے جو ان کی اپنی قوم میں فی الحال موجود نہیں۔ اس ابتدائی دور میں کارخانے، بینک اور معدنیات کے لئے فنی ماہرین بڑی تعداد میں درکار ہیں لیکن انڈونیشیا والوں نے ہر ایک ولندیزی ماہرِ فن کو نکال باہر کیا، اور اس کا خیال نہیں کیا کہ ہمارے تمام اہم کام رک جائینگے۔ ہالینڈ والے ہر حقیقت

رہنے دیا جائے، تاکہ دیگر تہذیبوں کی آمیزش سے اس کی دلکشی میں خلل نہ پڑے۔ اب جبکہ انڈونیشیا میں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم ہوگئی ہے، تو مسلمان حکمران جاوا کے زیادہ ترقی یافتہ حصوں سے یہاں آئے اور عورتوں سے اصرار کیا کہ وہ سینہ ڈھانکنے کے لئے کسی قسم کے کرتے پہنیں۔ اب اس جزیرہ کی پہلے کی سی حالت نہ رہے گی۔ حکومت نے وہاں کاشتکاری کے نئے طریقے جاری کر دیئے ہیں۔ تعلیم عام ہو رہی ہے اور مسلمانوں کے علاوہ عیسائی مبلغ بھی وہاں اڈے جمانے لگے ہیں۔ لیکن اب بھی رقص کے فن میں ان کی کم عمر لڑکیاں سارا برن ہارڈ کا مقابلہ کرتی ہیں۔

سماٹرا: مجھے سماٹرا کا جزیرہ جاوا سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ یہاں آبادی بہت کم ہے لیکن ٹین، پٹرول، ربر اور فطرت کی لامتناہی ثروت یہاں بکثرت ہے۔ اس میں بڑے بڑے طویل و عریض جنگل ہیں جو چھ چھ سو میل تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے قصبے انڈونیشیا کے علمی مرکز ہیں، جہاں کی آبادی کچھ ناقابل فہم اسباب کی وجہ سے صد فی صد لکھی پڑھی ہے۔ مثلاً یہاں کا ایک گاؤں ہے جس کا نام کوٹا گاڈانگ ہے، یہ سماٹرا کے آتش فشاں پہاڑوں کی بلندیوں پر کچھ نیم جنگلی جھونپڑیوں کا غیر اہم سا اجتماع دکھائی دیتا ہے، لیکن انڈونیشیا میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیڈر بڑی کثرت سے اسی ایک گاؤں میں سے ابھرے ہیں۔ ان میں مصنف بھی ہیں فلسفی بھی ہیں اور قانون و معاشیات کے ماہر بھی۔ اسی گاؤں کے لوگ تھے جنہوں نے اقوام متحدہ کو اپنی خطیبانہ تقریروں سے حیرت میں ڈال دیا۔ ایشیا بھر میں شاید کوئی اور شہر ایسا نہ ملے جس نے اتنی تعداد میں مشاہیر پیدا کئے ہوں۔ میں نے بہت لوگوں سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ اس اعجاز کا کیا راز ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف قسم کے مفروضات پیش کئے۔ کسی نے کہا کہ یہاں کے لوگ مدرسہ کے شوقین ہیں۔ کسی نے کہا یہاں کی آب و ہوا مردم خیز ہے۔ کسی نے کہا کہ یہاں اچھا گوشت زیادہ مقدار میں ملتا ہے لیکن مجھے ایک توجیہہ زیادہ یقین آور معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے، کہ یہاں عورتوں کا بڑا اقتدار ہے اور وہ اس پر تلی رہتی ہیں کہ کچھ بھی ہو اپنے لڑکوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں گی۔ عورتوں کے اس صالحانہ میلان نے ایک یہ اچھا نتیجہ پیدا کیا کہ قبیلوں کی باہمی جنگیں یہاں ختم ہوگئیں اور وہاں کے مشاغل میں اب یا علم و حکمت ہے، یا تفریح کے لئے رقص و سرود۔ مردوں کی طرف سے کسی قسم کا لغو جبر یہ عورتیں قبول نہیں کرتی ہیں لیکن یہاں کے ایک مشہور شہری نے اس توجیہہ کو ایک نئے انداز میں میرے سامنے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ماؤں کا اور بڑی بوڑھیوں کا اقتدار بیس برس تک بیٹوں پر اس قدر مسلط رہتا ہے، کہ وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ایسی محنت کریں اور ایسا کمال پیدا کریں کہ اس اقتدار سے ان کو چھٹکارا مل سکے، تاکہ باہر کی دنیا میں وہ آزادی سے کوئی بلند مقام اپنے لئے حاصل کر لیں جس کی بدولت اس گاؤں میں واپس آ کر پھر زنانہ تسلط کا جوا ان کی گردن میں نہ پڑے۔ سماٹرا کے جنگلوں میں بڑی کثرت سے درختوں پر بندر کودتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ خوش رنگ پرندے لاتعداد ہیں۔ جنگلوں میں ہاتھی جھومتے پھرتے ہیں جن کو پکڑ کر کسی کام پر نہیں لگا سکتے۔ بیس بیس فٹ لمبے اژدھے اور مگرمچھ ان جنگلوں اور ندیوں میں بھرے پڑے ہیں اور شیروں اور چیتوں کی بھی کمی نہیں۔

مسالوں کے جزیرے: انڈونیشیا کے شمال مشرقی حصہ میں وہ جزائر ہیں جنھیں مسالوں کا جزیرہ کہتے ہیں۔ ان مسالوں نے دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب پارٹ ادا کیا ہے قیمتی اور کمیاب مسالے یہیں پیدا ہوتے ہیں۔ دارچینی وغیرہ بڑی کثرت سے ملتی ہے مغرب والوں کو کہیں سے ان مسالوں کا چسکا پڑ گیا تھا اور اہل فرنگ کو یہ مسالے فقط قسطنطنیہ کی منڈیوں میں ملتے تھے پرتگالیوں نے یہ سوچا کہ کوئی ایسا بحری راستہ دریافت کریں کہ ترکوں سے نجات ملے اور وہ سمندر کے راستہ ہی سے یہ مسالے ارض فرنگ میں لے آئیں۔ چنانچہ واسکوڈاگاما اسی جستجو میں نکلا اور آخرکار کامیاب ہوگیا۔ کولمبس بھی حقیقت میں ان ہی جزیروں تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کے جغرافیائی معلومات بالکل بے تکے تھے۔ نکلا تھا مسالے کے جزیروں کی تلاش میں اور پہنچ گیا امریکہ کے کنارے۔ گویا امریکہ کی دریافت کا سبب بھی یہی مسالے ہوئے۔ اس تجارت سے نفع اندوزی ایسی غیر معمولی ہوتی تھی کہ ہسپانیہ، پرتگال اور برطانیہ ان پر قابض ہونے کے لئے آپس میں جنگیں لڑنے لگے اور آخر کار ان ہی مسالے کے جزیروں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لئے ہالینڈ نے رفتہ رفتہ ۱۶۲۳ء میں باقی انڈونیشیا پر بھی اپنا تسلط جما لیا۔ غالباً دنیا میں زمین کا کوئی اور ایسا ٹکڑا نہیں ہے جس میں اتنی تھوڑی زمین پر اتنی گراں بہا چیزیں پیدا ہوتی ہوں۔

اشتراکیت: ابھی تک انڈونیشیا میں سیاسی ہیجان زوروں پر ہے۔ مرکزی حکومت کے خلاف پانچ باغیانہ کوششیں جاری ہیں۔ تین تحریکیں تو سماٹرا، جاوا اور سیلبیز میں ہیں اور دو ملکہ میں۔ اسی شورش اور خلفشار کی وجہ سے وہاں کے سکہ کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے اور حکومت کو یہ دشواری پیش آرہی ہے، کہ دیگر ممالک سے ضروری اشیاء کی درآمد کے لئے رقم کافی نہیں ہوتی۔ ایک نئی مملکت کو اس قسم کی معاشی مشکلات اکثر پیش آتی ہیں جن پر نظم وضبط سے قابو پا سکتے ہیں لیکن ایک تحریک ایسی ہے جو اس مملکت ہی کو معرض خطر میں ڈال سکتی ہے۔ میری مراد اشتراکیت سے ہے۔ کسی چینی مدرسہ میں چلے جائیے وہاں آپ دیکھیں گے، کہ چین کے صدر ماؤزی تنگ کی تصویر ٹنگی ہوئی ہے۔ کمیونزم کے سرخ جھنڈے لگے ہوئے ہیں۔ مدرسے کے کمروں میں بڑے بڑے تصویری اشتہار دیواروں پر چسپاں ہیں جن میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ امریکہ والے ایشیا والوں کو جراثیم پھینک کر ہلاک کر رہے ہیں لیکن انڈونیشیا والے اس کے متعلق کسی پریشانی کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں یہ چینی اسکول ہیں، اگر اشتراکیت ان کو پسند ہے۔ تو ان کو حق ہے کہ وہ اشتراکی رہیں اور جس طرح چاہیں اس کی تبلیغ کریں۔ سورابایا میں سترہ چینی مدرسوں میں سے پندرہ اشتراکی ہیں بعض بڑے نئے مدرسے بھی اشتراکی ہیں۔ الیکشن میں ہر جگہ پوسٹر دکھائی دیتے ہیں۔ جن پر یہ عبارت لکھی ہے: "انڈونیشیا کی اشتراکی پارٹی، عوام کی حکومت، عوام کے ذریعہ، عوام کے لئے"۔ انڈونیشیا والے کہتے ہیں کہ یہ سب چینی تحریکیں ہیں، ان کا جو جی چاہتا ہے انہیں کرنے دیجئے۔ میں نے کہا: کہ تمہاری ٹریڈ یونین میں اشتراکیوں کا غلبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں، کہ ٹریڈ یونین کے ان چند لیڈروں کی کون سنتا ہے۔ انڈونیشیا والے عام طور پر اپنا یہی عقیدہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نہ اشتراکیت چاہتے ہیں اور نہ ٹریڈ یونین کا نظام۔ ان دونوں کی کشاکش سے ہم بے تعلق رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کیا اشتراکیوں نے دو مرتبہ

سے بڑے نہ تھے۔ انھوں نے اچھی سڑکیں بنائیں، اچھی ریلیں بنائیں، عمدہ شہر آباد کئے۔ چاول کے علاوہ باقی جتنی زرعی پیداواریں ہیں مثلاً شکر، کوکو، ربڑ، تمباکو، قہوہ، چائے، کونین، یہ سب ان ہی کی آوردہ ہیں۔ اسی پیداوار کی بدولت انڈونیشیا ایک دولتمند ملک ہوگیا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس دولت اور ترقی میں سے زیادہ حصہ اہل ملک کو نہ ملا۔ ولندیزیوں نے ایک اچھی بات یہ بھی کی، کہ بڑے بڑے مکھٹو زمیندار وہاں پیدا نہیں ہونے دئے۔ ایشیا بھر میں انڈونیشیا ہی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں زمین کے مسئلے نے کوئی پیچیدگی پیدا نہیں کی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعوں کے مالک خود کاشتکار ہی ہیں اور وہاں کی معاشی زندگی کا یہی ایک پہلو ایسا ہے، جو اشتراکیت کو وہاں پہنچنے سے روک سکتا ہے۔

انڈونیشیا کی کابینہ کے ایک وزیر نے مجھ سے کہا، کہ غالباً اس نسل کے بعد ولندیزیوں اور مغربیوں سے نفرت کا جذبہ فرو ہوجائیگا اور ہم مغرب کے متعلق اپنی رائے میں توازن پیدا کرلیں گے۔ انڈونیشیا میں اس وقت اقتدار زیادہ تر نوجوانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ زندگی میں بڑی گہما گہمی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں پر ایشیا کی تقدیر ڈھالی جا رہی ہے۔ سرکاری دفتروں میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، ان کی عمر عام طور پر تیئس ۲۳ برس سے کم ہی ہوتی ہے اور وزرا کی عمر کا اوسط بھی چونتیس ۳۴ برس سے زیادہ نہیں۔ جکارتا کا شہر جسے ولندیزی بٹاویا کہتے تھے فرنگیوں کا قبرستان کہلاتا تھا۔ وہ ایک دلدلی زمین پر بنا تھا اور ملیریا اور دیگر بخاروں سے وہاں بیشمار انسان موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ اب وہاں پہلے کی سی بدصحتی نہیں۔ آزادی سے پہلے اس کی آبادی ۷½ لاکھ تھی، اور اب یہ بڑھ کر تینتیس ۳۳ لاکھ ہوگئی ہے۔ ہوٹلوں میں جگہ نہیں ملتی۔ دو چار اجنبی شخص ایک ہی کمرے میں سونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ رہائشی مکان کا ملنا ناممکن ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ جکارتا کا شہری ایک ہفتہ کے لئے بھی اگر شہر سے باہر جائے تو احتیاطاً دوست احباب کو گھر میں رکھ جاتا ہے تاکہ خالی سمجھ کر اور قفل توڑ کر کوئی وہاں قابض نہ ہو جائے۔ اتنی کثیر آبادی کے لئے حفظان صحت کا انتظام مشکل ہے۔ گھنی آبادی میں سے جو نہر گزرتی ہے وہاں عجیب مناظر دکھائی دیتے ہیں، کوئی شخص سبزی ترکاری دھو رہا ہے، تو دو گز کے فاصلے پر کوئی غسل کر رہا ہے۔ کوئی دانت صاف کر رہا ہے اور کوئی وہیں پیشاب یا خانہ کر رہا ہے۔ کوئی مرغی ذبح کر رہا ہے اور کوئی مرے ہوئے بھینسے کی لاش کو دور ڈھکیل کر اپنے استعمال کیلئے پانی بھر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ایسے پانی کے کنارے رہنے والی آبادی میں جو پانچ بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے تین چھ برس کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی ملک عدم کو واپس ہو جاتے ہیں۔

انڈونیشیا کی معیشت میں ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ دکانوں کے مالک تقریباً سب کے سب چینی ہیں۔ یہ کارخانوں کے مالک بھی ہیں، ساہوکارہ بھی کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تجارت اور درآمد برآمد بھی ان ہی کے واسطہ سے ہوتی ہیں۔ اگر انڈونیشیا والوں سے کہو کہ یہ سب چینی تو اشتراکی ہیں انھیں نکال باہر کیوں نہیں کرتے تو وہ اس کا یہی جواب دیتے ہیں کہ ان کو نکالیں تو تجارت کون کریگا۔ اگر یہ کہا جائے، کہ تم خود تجارت کرو، تو عجیب لاابالی پن سے کہتے ہیں، کہ بھائی دکان پر کون بیٹھے لیکن سنجیدگی سے قوم کی فلاح اور اس کے مستقبل کے متعلق سوچنے والے اس کی امید رکھتے ہیں، کہ وہ دن آنے والا ہے کہ